ایسا بڑا اضافہ نہیں ہوا جو رسالہ کی مالی مشکلات کو حل کرنے کے لیے کافی ہو، صرف ساڑھے ستر نئے خریدار مہیا ہوئے لیکن ناظرین رسالہ میں سے متعدد حضرات نے جس خلوص اور ہمدردی کے ساتھ ہماری اپیل پر توجہ کی اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ جو لوگ اس رسالہ کو ملاحظہ فرماتے ہیں ان کی ایک بڑی اکثریت اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد سے دلی ہمدردی رکھتی ہے، فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ جن اصحاب نے توسیع اشاعت کے لیے عملاً کوشش کی، ان کا شکریہ ہم پر واجب ہے اگرچہ اس کا اصل شکریہ تو اللہ ہی ادا کرے گا جس کا کام سمجھ کر انہوں نے اس آواز کو اپنے دوسرے بھائیوں تک پہونچانے میں حصہ لیا۔

پچھلے مہینہ ایک صاحب خیر مسلمان رئیس نے پچیس روپے عنایت فرمائے تھے تاکہ ان کی طرف سے غریب مسلمانوں کے نام مفت یا رعایتی قیمت پر رسالہ جاری کر دیا جائے چنانچہ ایک دارالمطالعہ کو مفت اور آٹھ اشخاص کو نصف قیمت پر ایک سال کے لیے رسالہ دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے پاس بکثرت درخواستیں ایسے لوگوں کی آ رہی ہیں جو رسالہ پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں لیکن پورا چندہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے جن اصحاب کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اگر وہ اس سلسلہ میں تھوڑی مدد فرمائیں تو ان کے بہت سے غریب بھائیوں کو رسالہ سے استفادہ کا موقع مل سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ خود ادارۂ ترجمان القرآن کی مالی حالت اب کسی رعایت کی متحمل نہیں ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے اس کا تعلق کلیۃً صرف اُس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق

ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ محض نجات مطلوب ہو اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اُن پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے، اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گردوپیش کی ساری دنیا سے، ایک الگ چیز ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں۔ اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو، اس پر پوری زندگی کی عمارت، ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اسی لیے اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادّی علائق سے نفرت، لذات دنیوی سے کراہت، عالم اسباب سے بےتعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا، اس کو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں، اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی سے گندی اور بدتر سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہتا ہے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے، تاکہ خود

اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادت گاہوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے۔ سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے، اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر — جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے — جس طرح چاہا چلایا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کرلیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا، اس لیے اگر وہ ساتھ بھی رہا تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم وستم ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں، اور ہر قسم کی تمدنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہوسکتا تھا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی، سودخواری اور قارونیت کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فطری تصور پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کرکے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جزو نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو۔ صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان

میں ہر ہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کرکے دکھائے، راہِ کج سے بچائے، راہِ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اِس لامتناہی سفر میں، جو دنیا سے لیکر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گذار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنیکا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اسکو بھی پرانے جاہلی تصور کے تحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے۔ یہ جسقدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعے کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں۔ اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں، دونوں ملکر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں۔ اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

اسلام ایک خاص طریق فکر (Attitude of mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ (out look on life) ہے پھر وہ ایک خاص طرز عمل ہے جس کا راستہ اسی طریق فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریق فکر اور طرز عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے، وہی تہذیب اسلامی ہے، اور وہی تمدن اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں

نہیں ہیں بلکہ سب ملکر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریق فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے: انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابتداروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، قوم و ملت کے، ملک و وطن کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوع انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر قوت کے کیا حقوق ہیں؟ پھر یہی طریق فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے مقصود متعین کرتا ہے، اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو، خواہ وہ کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔ یہ مقصد ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے جو شے مقصد کے حصول میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے، اور جو شے سدّ راہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کار فرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، طہارت میں، صنفی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ مرکز مقصود کی طرف جانے والی .... سیدھی راہ پر قائم رہے، اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزلِ مقصود کی طرف جانے والے ہوں، اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لیے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے

استعمال کرے تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اسکی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں، اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراک اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اُس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصلِ فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروان اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطہ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کارزار تک، طریق عبادت سے لیکر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لیکر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثار فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبیعی کی بلند ترین تحقیقات تک زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس لیے جوڑا گیا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا، اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے، مگر آج بھی آہنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرہ آفاق یونیورسٹیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے اَن پڑھ اور کَودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور ذہنیتوں میں

منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے "تاریک" حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دینداری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیال"۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے اور تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقام حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگان نور علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم اپنے قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

فہم و ادراک کے اس قصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے، بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے، اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر مسلمان۔ اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے، ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام، اور پھر پنجابی، بنگالی، کوکنی، اور مدراسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے، زندگی کا ایک جداگانہ نقطۂ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے، ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں، اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے، اس لیے کہ اسلام ایک "مذہبی ضمیمہ" ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیے، دین کا تعلق

ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں یعنی اعتقادات اور عبادات۔ اس حد تک مسلمان اپنی الگ راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات، تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ انکو انجام دیتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہیے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے لیے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک مشترک نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہو جانا چاہیے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے اٹھے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبیعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں، اس لیے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں وہی ان کے نزدیک اصلی اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عمل کی تہ میں کام کرتا ہے اور جو اپنے طریق فکر و زاویہ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راستہ اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمنی، یا اطالوی یا فاروقی و خالدی، ان کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی ذہن" ہیں کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور تمکن فی الارض۔ جس کو زمین کی "وراثت" حاصل ہے وہ "صالح" ہے اگرچہ وہ ابراہیم کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ مسیح کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا ہی کیوں نہ ہو!

ایک بڑا گروہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کیلئے اٹھا ہے اس کے نزدیک اسلام اور اسکی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ ان کے "مسلم پرسنل لا" کی حفاظت کا اطمینان دلا دیا جائے۔ انکی زبان کو

اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کرلیا جائے اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو صرف انہی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اگر یہ فیصلہ کردیا جائے کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اس وقت تک نافذ نہ ہوگا جب تک خود مسلمان نمائندوں کی غالب اکثریت اسکو قبول نہ کرے تو ان کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہوگیا

دیکھا آپ نے! شکلیں کس قدر مختلف ہیں مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں اسی جاہلی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے تو ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہوسکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمۂ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریاتِ دین کا منکر نہ ہو۔ لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے اُس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہے، ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کرسکتے ہیں جو مجرد اقرار اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ تمہارا طریق فکر وہی ہو جو قرآن کا ہے زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو جو قرآن کی نظر ہے تم اشیاء کی قدریں (values) اسی معیار کے مطابق معین کرو جو قرآن نے اختیار کیا ہے، تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو جو قرآن نے پیش کیا ہے، اور تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی بنا پر انتخاب کرو جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔ اگر تمہارے ذہن کو یہ چیز اپیل نہیں کرتی، اور تمہارے نفسیات قرآنی نفسیات کے سانچے میں ڈھلنا قبول نہیں کرتے، تو کوئی تم کو دائرۂ اسلام میں آنے یا رہنے پر مجبور نہیں کرتا۔ عقل اور راست بازی کا اقتضا یہ ہے کہ تم کو اس دائرے کے باہر اپنے لیے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ لیکن اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد

کر لیتے ہو، تو پھر زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اُس راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا جسے قرآن سبیل المومنین کہتا ہے۔ اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن ـــ کہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں ـــ جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے، چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعائر" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے، ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہننے کے سامان میں، لباس کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں، مادی وسائل اور قوانین طبیعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں، بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے، طریق فکر ایک ہے، نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے، اس لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصولوں کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے۔ جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے، اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی۔ آپ خواہ ہندوستانی ہوں یا ترکی یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی اور ہر اُس اسکیم کو رد کر دینا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔ یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے اور دوسرا مرحلہ نتائج کا۔ آپ زندگی کے پہلے مرحلہ میں دنیا کو جس طرح برتیں گے، دوسرے مرحلہ میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے۔ اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو

صحیح طریقہ سے برتیں جس سے دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے، اور اس میں اعتقادات وعبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اس اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ الگ پارٹیوں میں منقسم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہی پارٹی ـــــ حزب اللہ ـــــ ان سب کاموں کے لیے کافی ہے، کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراک عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں۔ کیوں نہ آپ ان اصولوں کے مطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں، وہ اگر مجبوراً تنازع طبقات (Class War) کی آگ میں کودتے ہیں تو آپ کیوں ان کے پیچھے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں، علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے اور ایک وہ تھا جو صحابہ کرام اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں، اور دونوں تسخیر عناصر، استعمالِ اسباب اور قوانین طبیعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں، مگر زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بُعد ـــــ بعد المشرقین ـــــ ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن، اس تسخیر عناصر اور استعمال اسباب کا نتیجہ ہے جس کی تہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے، وہ بھی

اگرچہ تسخیر عناصر اور استعمال اسباب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، مگر اس کی تہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو، اور جب تک کہ زندگی کی ساری جدوجہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے ۔۔۔ وہی "ارکان اسلام" جن کو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی حقوق کو سمجھنے اور ان کے تحفظ کے صحیح طریقے معلوم کرنے میں جو غلطی کی جا رہی ہے، اس کی تہ میں بھی وہی جہل کار فرما ہے جس کے مظاہر آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی پوری اسکیم اگر غیر اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے تو جس چیز کو آپ "مذہب" کہتے ہیں، اور جسے "پرسنل لا" قرار دیتے ہیں اس کا اپنی اصل پر باقی رہ جانا، اور آپ کی زبان کا اپنے رسم الخط کے ساتھ محفوظ رہنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا، اس لیے کہ اس غیر اسلامی مجموعہ میں یہ بے جوڑ اسلامی اجزا کسی طرح کھپ نہ سکیں گے اور رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑتے چلے جائیں گے۔ پھر ان اجزاء کی حفاظت جن نمائندوں کے ہاتھ میں آپ دینا چاہتے ہیں وہ اگر محض اصطلاحی و قانونی مسلمان ہوں تو وہ ان کی حفاظت بس اتنی ہی کر سکیں گے جتنی غیر مسلم کر سکتے ہیں۔ ایسے مسلمان اگر اسلامی اصولوں کے خلاف ۵۲ نہیں ۹۲ کی اکثریت سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ اسلامی جماعت کے لیے اتنا ہی نقصان دہ ہوگا جتنا غیر مسلموں کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

دراصل ہمارے قومی مسائل وہ ہیں ہی نہیں جن کو حل کرنے کی آج کل کوششیں کی جا رہی ہیں اصل مسئلہ کچھ اور ہے جسے سمجھانے کے لیے ہم کئی مہینے سے دماغ سوزی کر رہے ہیں، مگر افسوس کہ اس ہنگامۂ قیل و قال میں کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔